جذبۂ رقابت مترشح ہوتا ہوا ابن خلدون نے بھی اسی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے اپنی سوانح "التعریف" میں اپنی غرناطہ سے واپسی کے اسباب کے سلسلے میں، صرف چند سطریں لکھی ہیں جن سے کوئی نتیجہ نکالنا دشوار ہے اس تحریر کے علاوہ سوائے ابن خطیب کی تعریف و توصیف کے کوئی عبارت نہیں ملتی۔ علامہ المقری نے بہت تعجب سے لکھا ہے[1]:

"ابن خلدون کو اگرچہ ماضی کی تلخیوں کی بنا پر ابن خطیب کا مداح نہ ہونا چاہیے لیکن ابن خلدون نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا یا لکھا اس سے بے حد خلوص ٹپکتا ہے۔"

ابن خلدون نے "کتاب العبر" میں ابن خطیب کی بے حد تعریف لکھی ہے اور اپنے "مقدمہ" میں اس کے موشحات جادہ الغیث الخ کو نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے معاصر ابن خطیب امام نظم و نثر تھے، علوم ظاہری میں ان کا کوئی ہم پلہ نہ تھا نیز اپنی سوانح "التعریف" کے صفحہ ۱۵۵ پر لکھا ہے:

"وکان الوزیر ابن الخطیب آیۃٌ من آیات اللّٰہ فی النظم والنثر والمعارف والآداب، لا یُساجل مداہ، ولا یھتدی فیھا بمثل ھُداہ"

ان شواہد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ابن خلدون کو ابن خطیب سے مخاصمت یا دشمنی ہوتی تو وہ غرناطہ چھوڑنے کے بعد اس کا اظہار کرتا اس کے برعکس وہ ابن خطیب کے مقام فاس میں محبوس کر لیے جانے پر محمد خامس کے پاس اس کی برأت و خلاصی کی سفارش کرنے گیا۔ اس سفارش کی ناکامی کا ذکر اس نے اپنی سوانح میں بھی کیا ہے۔ باہمی چپقلش یا مناقشہ کی کوئی بھی تفصیل ابن خلدون، ابن خطیب اور ابن زمرک تینوں معاصرین کے درمیان ہونے والی خط و کتابت میں بھی نہیں ملتی[2]۔ البتہ ابن خلدون نے اپنی سوانح "التعریف" میں یہ عذر کیا ہے کہ قیام غرناطہ کے زمانہ کی تمام خط و کتابت جو اس کے اور ابن خطیب کے

---

[1] علامہ مقری: نفح الطیب ج ۴ ص ۱۹۵ - ۲۰۱

[2] دائرۃ المعارف: جلد ۳ ص ۱۳

درمیان ہوئی وہ قطعی مجہول گیا ہے مزید یہ کہ اُس نے اپنی سوانح کے صفحہ ۴۷ سے ابن زمرک کے مندرجہ خطوط سے وہ عبارت حذف کر دی ہے جس سے گذشتہ حالات پر روشنی پڑتی تھی اور وضاحتاً لکھا ہے کہ اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ابن خطیب نے اپنی کتاب "الاحاطة فی اخبار غرناطة" میں ابن خلدون کی سوانح حیات لکھتے ہوئے اندلس میں اسکی اہمیت اور بلند مقامی کا ذکر کیا ہے اور اسکی بے حد تعریف و توصیف کی ہے[1] تقریباً تین سال کے قیام کے بعد جب ابن خلدون غرناطہ سے رخصت ہونے لگے تو سلطان محمد خامس کی جانب سے ان کو ایک سرکاری مرقومہ Official Proclamation پیش کیا گیا جس میں اُن کی مخلصانہ خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا اور اُن کے رخصت ہونے پر اظہار افسوس نیز ان کو یہ بھی پیش کش کی گئی تھی کہ جب بھی وہ غرناطہ آنا چاہیں اُن کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ یہ مرقومہ ابن خطیب نے لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں[2]:

> هذا ظهير كريم تضمن تنويهاً وترفيعاً، وإكراماً وإعظاماً، ووضعت ... لعمل الصنيعة ختاماً، وعلى الذي أحسن تماماً، وإشاداً للمعتمد به بالاغتباط الذي راق قساماً، وتوفر أقساماً وأعلن له بالقبول، إن نوى بعد النوى رجوعاً أو آثر على الظعن المزمع مقاماً .... ويؤدي من امتثال هذا الأمر الواجب المفترض بحول الله وقوته۔

بالآخر اسلامی دُنیا کا یہ عظیم مؤرخ بادلِ ناخواستہ سرزمینِ غرناطہ کو خیرباد کہہ کر بجایہ افریقہ میں جا بسا وہاں اس کی بیحد پذیرائی ہوئی۔ اس طرح اندلس کی تاریخ دو عظیم مؤرخوں کی باہمی آویزش و کشمکش کی روح فرسا داستان سے محفوظ رہ گئی۔

---

[1] ابن خلدون: التعریف ص ۹۲۔

چوتھی قسط

ہندوستہذیب اور مسلمان

از ڈاکٹر محمد عمر صاحب اُستاذ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ہندو مذہب کے متعلق مسلمانوں کی رائے

عرصۂ دراز سے ساتھ ساتھ بود و باش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ہندو مذہب کے حُسن و قبح کا گہرا مطالعہ کیا اور اس پر اپنی آراء کا بڑی وضاحت سے اظہار کیا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ داراشکوہ نے مجمع البحرین میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام دو متضادُ مذاہب نہیں ہیں بلکہ اُن کا چشمہ ایک ہی ہے۔ دو مختلف دھارائیں الگ الگ بہتی نظر آتی ہیں لیکن بالآخر وہ دونوں ایک ہی نقطے پر ایک سمندر سے مدغم ہو جائیں گی۔ ملا شاہ اور دیگر مشائخ جن کا اندازِ فکر داراشکوہ نے اختیار کیا تھا، اُن کی وحدت الوجودی مشرب اور ہندو ویدانت کے فلسفے میں کوئی بنیادی فرق نہ تھا، اور فلسفۂ وحدت الوجود سے وحدتِ ادیان کے تصور تک پہنچنے میں کوئی ناقابلِ عبور دشواری نہ تھی۔ چناں چہ دارا نے دیگر مذاہب اور بالخصوص ہندو ویدانت میں چھان بین شروع کی اور اس تجسس اور تحقیق کا نتیجہ مجمع البحرین کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دارا نے اس میں لکھا ہے:

"می گوید فقیر بے اندوہ محمد داراشکوہ کہ بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیقِ رموز و دقائقِ مذہب حق صوفیہ، و فائز گشتن بایں عطیۂ عظمیٰ دراں شد کہ درک کہنہ مشربِ موحدانِ ہند و محققان ایں قوم قدیم نماید۔ با بعضے از کاملانِ ایشاں کہ بہ نہایت رضائت و ادراک

وفہمیدگی و غایت تصوف و خدا یابی و سنجیدگی رسیدہ بودند، مکرر صحبت ہا داشتہ و گفتگو نمودہ جز اختلافات لفظی دریافت وشناخت تفاوتے ندیدہ۔ ازیں جہت سخنان فریقین را بہم تطبیق دادہ و بعضے سخنان کہ طالبان حق را دانستن آں ناگزیر و سودمند است، فراہم آوردہ" لہ

مجمع البحرین میں دارا نے تصوف اور یوگ کے خیالات جمع کئے ہیں اور اُن دونوں میں مطابقت ثابت کی گئی ہے۔ بعد ازیں دارا نے ویدانتوں اور ہندو موحّدین کے خیالات کو بڑی محنت اور تیزی سے فارسی زبان میں منتقل کرانے کا کام شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر رسالہ "مکالمۂ داراشکوہ و بابا لال" مرتب ہوا اس کے بعد جوگ بسشٹ کا آسان فارسی میں ترجمہ ہوا ان دونوں کتابوں سے اہم تر سرِّ اکبر ہے لہ۔ اس کا مقدمہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ داراشکوہ نے چاروں ویدوں کو الہامی کتابیں بتایا ہے لہ

مختصر یہ کہ فارسی میں مہابھارت لہ، بھگوت گیتا اور سنسکرت کی دوسری کتابوں کا ترجمہ ہونے اور مسلمانوں کو ہندو عالموں اور پنڈتوں اور اُن کے اہل فکر و نظر سے ربط و ضبط کا موقع ملنے کا مجموعی نتیجہ بقول شیخ اکرام یہ ہوا کہ:

"ہندو ویدانتی یہ دیکھنے لگے کہ مثنوی مولانا رومؒ اور اسلامی تصوف کی کتابوں میں

لہ ماخوذ از مقدمہ اوپانیشاد (فارسی ترجمہ) ص ۲۱۷

لہ ۱۹۶۱ء میں یہ کتاب ایران میں چھپ گئی ہے۔ اور ڈاکٹر تارا چند اور ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے ایڈٹ کیا ہے۔

لہ ملاحظہ ہو: اوپانیشاد (مقدمہ) ص سہ تا شش

لہ اکبر بادشاہ کے عہد میں مہابھارت، رامائن، اتھربان، لیلاوتی، نازک، کلیلہ و دمنہ، نل، دمن، سنگھاسن بتیسی، معجم البلدان وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ ہوا تھا۔ اس کے تفصیل ملاحظہ ہو۔ Studies in Medieval Indian History and Culture by K. A. Nizami, PP. 167 – 171 (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کئی ایسی باتیں ہیں جنھیں وہ اپنا کہہ سکتے ہیں اور بعض مسلمان بھی سمجھنے لگے کہ ہندوؤں میں فقط بُت پرست اور دیوتاؤں سے انسانی اوصاف اور عام بشری خصائص منسوب کرنے والے لوگ نہیں بلکہ کئی پاکیزہ خیال۔ بے حرص اور بے ریا تارکانِ دُنیا بھی ہیں"۔ [1]

جہانگیر[2] کی طرح شاہجہاں ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کا قائل نہ تھا لیکن اس کے دورِ حکومت میں یہ رجحانات ختم نہ ہوئے تھے۔ اور اُس کے آخری دنوں میں تو دارا شکوہ کی شرکت سے انھیں بڑی تقویت ملی تھی مسلمانوں میں داراشکوہ، مُلا شاہ، سرمد شہید[3] اور محسن فانی[4] کے علاوہ دوسرے کئی آزاد خیال اس روحانی مفاہمت کے ترجمان تھے اور دارا شکوہ کے حاشیہ نشین تھے۔ اُن کے علاوہ دوسرے کئی ایسے مسلمان تھے جو ہندو سادھوؤں اور جوگیوں کی روحانیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۵) بدایونی منتخب التواریخ (اُردو ترجمہ پاکستان ۱۹۶۲ء) ص ۵۰۸، ۵۱۷۔

آئینِ اکبری (انگریزی ترجمہ) جلد اول۔ ص ۱۱۰-۱۱۲، ۴۹۷-۴۹۸

[1] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ خزینۃ الاصفیا جلد دوم۔ ص ۲۷۶-۲۷۸

[1] رودِ کوثر۔ ص ۴۰۲

[2] جہانگیر نے تزک جہانگیری میں گسائیں جدروپ سے اپنی ملاقاتوں کا حال کئی جگہ درج کیا ہے وہ اس کی ریاضت اور زہد سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو دبستان مذاہب۔ محسن فانی نے جہانگیر اور اکم ناتھ جوگی کی گفتگو کا ذکر کیا ہے۔ ص ۱۴۷

[3] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ دبستان مذاہب۔ ص ۲۴۲-۲۴۳، کلمات الشعرا ص ۵۰-۵۱۔ رودِ کوثر۔ ص ۳۸۶-۳۹۲۔

[4] عام طور پر محسن فانی، دبستان مذاہب کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں ایشیا کے تمام مشہور مذہبوں کے خیالات و عقائد جمع کیے گئے ہیں۔

سے قائل تھے اور ان سے مل کر متاثر بھی ہوتے تھے۔ ملاّ شیداؔ[۵۱] کی رائے ایک گیانی جوگی کے متعلق محسن فانی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

" ملاّ شیدائے ہندی، کہ از شعرائے نامدار و فصحائے عصر بود، نوبتے با راقم بخانۂ گیانی زینی، رفت و با ایشاں صحبت داشت۔ مریدان او را دیدہ و وضع اہلِ خانہ را مشاہدہ نمودہ بشگفتگی فرو ماند و گفت۔ تمام عمر من در خدمت وارستگان گزشت، چشمِ من چنیں آزادے ندید، و گوشم چیزے از انسان وارستہ نشنودہ" [۵۲]

اس آزاد خیالی اور دارا شکوہ کے ساختہ ماحول کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں پر بیراگیوں اور جوگیوں کے عقائد کا بہت گہرا اثر پڑا اور بہتوں نے ان کی مصاحبت اختیار کر لی۔ دبستانِ مذاہب میں لکھا ہے:

" از ہندو و مسلم و غیر ہم ہر کس خواہد، بکیش ایشاں درآید، مانع نشوند و در پذیرند و گویند مسلمانان نیز بشن را می پرستند۔ چہ بسم اللہ ایں معنی دارد یعنی بشن و بسم، بشن را گویند" [۵۳]

[ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے جو کوئی بھی اُن کے مذہب میں آنا چاہتا ہے، وہ اُسے قبول کر لیتے ہیں اور مانع نہیں ہوتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ مسلمان بھی بشن کی پرستش کرتے ہیں

---

[۵۱] جہانگیر کے عہد کے آخری زمانے اور شاہ جہاں کے ابتدائی دورِ حکومت میں ہندوستان آئے اور شعر و شاعری کا بازار گرم کیا۔ وہ پُر گو شاعر تھا اور اپنے زمانے میں عدیم المثال سمجھا جاتا تھا ملاحظہ ہو۔ سرخوش۔ کلمات الشعرا۔ ص ۵۶-۵۸

[۵۲] دبستان مذاہب۔ ص ۱۷۳

[۵۳] دبستان مذاہب۔ ص ۲۰۰

کیونکہ بسم اللہ کے یہی معنی ہیں، یعنی بشن کو بسم بھی کہا جاتا ہے]

جو مسلمان بیراگیوں میں شامل ہوتے تھے وہ جاہل اور عوام الناس نہ تھے بلکہ تعلیم یافتہ اور شریف زادے تھے۔ دبستان میں لکھا ہے۔

"جمعے کثیر از مسلمانان بکیش ایشان در رفتہ اند۔ مانند میرزا صالح و میرزا حیدر کہ از نجبای مسلمانان اند و بیراگی شدند" [1]

[بہت سے مسلمان ان کے مذہب میں داخل ہو گئے ہیں، مثلاً میرزا صالح اور میرزا حیدر، جو مسلمان شریف زادے ہیں، بیراگی ہو گئے ہیں]

دبستان میں لکھا ہے کہ عارف سبحانی[2]، درویش، مسجد اور مندر دونوں کی برابر تعظیم کرتے تھے اور مندر میں ہندوؤں کے آئین کے مطابق پوجا اور ڈنڈوت یعنی پرستش کے مراسم ادا کرتے تھے، اور ساتھ ساتھ مسجد میں مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے۔ آگے لکھا ہے:

---

[1] ایضاً ص ۲۰۳ محسن فانی نے میاں لال نامی ایک اور مسلمان بیراگی کا ذکر کیا ہے۔ دبستان مذاہب۔ ص ۲۰۴

[2] آبائی وطن ہرات تھا لیکن وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کو علوم نقلی و عقلی پر پوری دسترس حاصل تھی ترک و تجرید کی زندگی گزارتے تھے۔ سالہا کامل مرشد کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے رہے، اور بالآخر شیخ مجد الدین محمد بلخی قادری کے ہاتھ پر بیعت کی، جو بڑے زاہد متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ انھوں نے محی الدین ابن عربی کی تمام تصانیف اپنے استاد سے پڑھی تھیں۔ ستر پوشی کے علاوہ وہ اپنے پاس کوئی دوسرا کپڑا نہ رکھتے تھے اور جانوروں کا گوشت بھی نہیں کھاتے تھے۔ کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا اور اگر کوئی کچھ دیدیتا تھا تو قبول کر لیتے تھے لوگوں کی حقارت اور اہانت سے رنجور نہیں ہوتے تھے۔ شب بیداری کرتے تھے۔ دبستان کے مصنف نے انھیں ۱۰۴۶ھ میں دیکھا تھا دبستان مذاہب ص ۳۹۱-۳۹۳

* * * *

"دنکوہش ہیچ دین وآئین نمی کند وکیشی را بکیشی ترجیح نمی دہد و تعصب در سرشت او نیست" [1]

[وہ کسی کے دین اور رسوم ورواج کی بُرائی نہیں کرتے اور نہ ایک مذہب کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کی طینت میں تعصب بھی نہیں ہے]

اُن کا مسلک وحدت الوجود تھا۔ "وہرچہ بنظر او درآید او را وجود مطلق شمرد وگرامی می دارد" [2]

آج بھی ہندوستان کے مسلمانوں میں مداریہ اور جلالیہ وغیرہ ایسے فرقے پائے جاتے ہیں جن کے اعتقادات، عادات اور اطوار پر سنیاسیوں اور جوگیوں کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کا بعد میں تفصیلی ذکر کیا جائے گا۔

دوسری طرف ہندوؤں میں بھی اس روحانی اشتراک اور آمیزش کو فروغ دینے والے کئی صاحب فکر تھے۔ اُن میں سے چندربھان برہمن [3] تھا جو داراشکوہ کا منشی تھا اور فارسی میں پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ سرخوش نے اس کے متعلق لکھا ہے:

"طبعی درست داشت۔ شعر بطور قدما شستہ وصاف می گفت وسلیقۂ انشاپردازی

---

[1] دبستان مذاہب ص ۲۹۲

[2] ایضاً ص ۲۹۲

[3] برہمن کے والد کا نام دھرم داس تھا۔ برہمن لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ عبدالحکیم سیالکوٹی کا شاگرد تھا۔ وہ پہلے افضل خاں (ملا شکر اللہ شیرازی جو شاہجہاں کے عہد میں میر سامان اور دیوان کل تھا اور جس کا انتقال [illegible]۲۳ھ میں ہوا تھا۔ مآثر الامرا جلد اول ۱۴۵-۱۵۱) کا ملازم تھا۔ اس کے انتقال کے بعد شاہجہاں کا ملازم ہوا۔ بعد ازیں داراشکوہ کے یہاں ملازم ہوا۔ اُسے رائے چندربھان کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ سنہ [illegible]ھ میں بنارس میں وفات پائی۔

نیز داشت۔ در ہندواں غنیمت بود۔" [1]

ایک دن شاہجہاں نے اس سے شعر خوانی کی فرمائش کی۔ برہمن نے یہ شعر پڑھا:

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار

بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

یہ شعر سن کر بادشاہ کو طیش آگیا اور اس نے کہا "ایں بدبخت کافر مرتد است" اس کو قتل کر دینا چاہیے۔ افضل خاں نے عرض کیا کہ سعدی کا یہ شعر مندرجہ بالا شعر سے مطابقت رکھتا ہے۔

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد

یہ سن کر بادشاہ ہنس پڑا۔ اور دوسرے کام میں مشغول ہوگیا۔ مگر اس کو دیوان خاص سے باہر نکال دیا گیا۔ [2]

داراشکوہ کی وفات کے بعد اس کے رفقائے کار اورنگ زیب سے وابستہ ہو گئے۔ برہمن نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور آخر عمر تک اس کا ملازم رہا۔ اس نے اورنگ زیب کی تعریف میں بڑے پرزور اشعار کہے ہیں۔

برہمن کی ایک صوفیانہ مثنوی مجموعۂ رسائل میں لکھنؤ سے ۱۸۸۳ء میں شائع ہوچکی ہے۔ نازک خیالات نام کی اس کی ایک دوسری تصنیف ہے جو اس نے اتما ولاس سے ترجمہ کی تھی، جس کا مصنف شنکر چاریہ تھا۔ یہ کتاب ۱۹۱۰ء میں لاہور سے چھپ چکی ہے۔ [3]

---

[1] کلمات الشعراء ص ۱۸۔ شاہجہاں کے عہد کی مستند تاریخ عمل صالح میں اس کی نسبت لکھا ہے "ہر چند بصورت ہندو است لیکن دم در اسلام می زند"

[2] کلمات الشعراء۔ ص ۱۸

[3] Persian Literature (Section II) P. 571

اب اس کا کلیات نظم بھی چھپ گیا ہے۔[۱]

اسی زمانے میں بھوپت رائے نام کا ایک شاعر تھا۔ بے غم تخلص اور بیراگی لقب تھا۔ شاعری میں محمد افضل سرخوش کا شاگرد تھا۔[۲] اور بعد میں بندرا بن داس خوشگو کی شاگردی اختیار کرلی تھی۔[۳] طریقت میں شیخ الشیوخ محمد صادق[۴] اور نرائن بیراگی کا مرید تھا۔[۵]

وہ قوم کا کھتری تھا۔ اس کے آبا و اجداد سرکار جون (جو پنجاب میں تھی) کے قانون گو تھے۔ جب اس پر جذبۂ عشق کا غلبہ ہوا تو اس نے علائق دنیا سے بے تعلقی اختیار کرلی۔ نرائن چند نام کے ایک ہندو لڑکے پر فریفتہ ہوا اور بیراگیوں کا لباس اختیار کیا۔ اس طرح اس نے مجازی عشق سے حقیقت کی منزلیں طے کیں۔ ہندی کی کتاب "پربودھ چندر ناٹک" کو اس لڑکے کے نام سے نظم میں منتقل کیا۔[۶]

---

[۱] اس کے کلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جندر بھان اسلامی تخیل میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کے اشعار میں وحدت الوجود کے مراحل اور عشق حقیقی کی کیفیات کا تذکرہ اسی انداز سے ملتا ہے جس طرح دوسرے مسلمان شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

[۲] سرخوش نے اس کی نسبت لکھا ہے "مردیست از علائق دنیوی برجستہ و از قیدہا دینی و تونی رستہ ...... دارد۔ پیش فقیر مشق سخن میکند و اصلاح میکرد و کارش روز بروز در ترقیست" کلمات الشعراء ص ۹ خوشگو نے لکھا ہے کہ سرخوش کی خدمت میں بیٹھ "صحبت ایشاں کہ اوقات بگفتگوی توحید میگذشت۔ خیلی بار بود" سفینۂ خوشگو۔ ص ۱۰۱

[۳] سفینۂ خوشگو۔ ص ۱۰۱

[۴] رود کوثر۔ ص ۴۰۴

[۵] سفینۂ خوشگو میں نرائن بیراگی کی نسبت لکھا ہے "مردیست وارستہ و فہمیدہ بود۔" ص ۱۰۱

[۶] سفینۂ خوشگو۔ ص ۱۰۱۔ کلمات الشعراء "قصہ از کتب ہندی و در زمین شاہنامہ بنظم در آوردہ و مطالب تصوف را خوب توضیح نمودہ" ص ۱۹

خوشگو کا بیان ہے کہ بیدم متعدد کتابوں کا مصنف تھا۔ ہندوستان کے فقیروں کے قصّے اس نے ایک مثنوی کی صورت میں بیان کیے تھے۔ اس کے فارسی کلیات میں پچاس ہزار اشعار تھے۔ ایک دیوان غزل اور رباعیوں کے علاوہ باقی مثنویاں ہیں[1]۔ اس کا انتقال ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں ہوا تھا[2]۔

بیدم کی شخصیت کے بارے میں شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ "نرائن بیراگی اور محمد صادق کے دوگونہ مواعظ سے اس کا قلب مجمع البحرین بن گیا تھا۔ چناں چہ اس کی مثنوی میں جا بجا دورنگی موجوں کا سراغ ملتا ہے۔ جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں اسلامی اور ہندو تصوف کا رنگ علیحدہ علیحدہ نظر آئے گا[3]۔

بیدم کی اس رباعی میں فلسفۂ وحدت الوجود کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

دریا در موج و موج اندر دریا ست — در ذات و صفات حق تفاوت ز کجا ست

ای تو حقیقت نظر افگن بمجاز — بے رنگ بہ صد رنگ جہاں جلوہ نما ست[4]

ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی آمیزش کی یہ کوشش صرف فارسی زبان تک ہی محدود نہ تھی بلکہ دارا شکوہ کے ہندو دوستوں نے سنسکرت میں بھی انھیں منتقل کیا چناں چہ مجمع البحرین کا "سمودرسنگم" کے نام سے اسی زمانے میں سنسکرت میں ترجمہ ہوا اور دوسری کئی تصوف کی کتابیں بھی اس زبان میں منتقل ہوئیں[5]۔

دارا شکوہ کے قتل کے بعد ہندو مسلم روحانی آمیزش اور اتحاد کی یہ تحریک ختم نہیں ہوئی لیکن اس کی رفتار ضرور سست پڑ گئی کیونکہ اپنی زندگی ہی میں اُسے اپنی اس آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے خلاف مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ علمائے ظاہر اور اہل فکر کی ایک بااثر جماعت اس تحریک کو ناکام بنانے کی پوری کوششیں کر رہی تھی" وہ تصوف میں غیر اسلامی عنصر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی"

---

[1] سفینۂ خوشگو، ص ۱۰۲ [2] ایضاً ص ۱۰۲ [3] رودِ کوثر، ص ۵۰۴ [4] سفینۂ خوشگو، ص ۱۰۳ [5] رودِ کوثر، ص ۵۰۴، [6] ایضاً ص ۱۰۵